صدف
تمام
ریت
ریت



علی الدین نوید

جملہ حقوق بحقِ "جمشید رعنا" محفوظ

○ طبع : اوّل
○ تعداد : ایک ہزار
○ سنہ طباعت : دسمبر ۱۹۷۹ء
○ قیمت : بارہ روپے

○ سرورق، تزئین : اعظم راہی، سلام خوشنویس
○ کتابت : محمود سلیم
○ طباعت : جے رام پرنٹرس چھتہ بازار حیدرآباد
○ بلاکس طباعت : ڈالٹن پریس حیدرآباد
○ ناشر : حیدرآباد لٹریری فورم (حلقہ)
○ زیرِ اہتمام : اِدارۂ پیکر، حیدرآباد

معاونت : اُردو اکیڈمی، آندھرا پردیش، حیدرآباد
ایچ۔ ای۔ ایچ دی نظامس اُردو ٹرسٹ

ملنے کے پتے :
○ اُردو اکیڈمی آندھرا پردیش، اے سی گارڈز حیدرآباد
○ الیاس ٹریڈرس۔ شاہ علی بنڈہ حیدرآباد
○ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی ـــ بمبئی ـــ علی گڑھ
○ شب خون کتاب گھر، 313 رانی منڈی الہ آباد۔3
○ مصنف - 351-3-16 چنچل گوڑہ حیدرآباد۔500024

موجودہ پتہ : 16-3-410 چنچل گوڑہ حیدرآباد
فون نمبر 2441443

والدہ محترمہ کی نذر



خوشبو

آواز

اور

رنگ کے نام



ریگ زاروں ہی سے پیاس اپنی بجھانی ہے نوید
جی میں آتا ہے کہ اب دشت کو دریا لکھیں



ترتیب

نظمیں ۱۹۶۰ء تا ۱۹۷۹ء

"ذات سے کائنات تک"

میری زندگی "تیز و تند ہواؤں میں جلتا ہوا اِک چراغ ہے۔ روزِ اوّل ہی سے تشنگی میرے حصّے میں آئی۔ پولیس ایکشن (POLICE ACTION) کے دوران جبر و استبداد کے سفّاک ہاتھوں، میرے والد، چچاؤں اور دیگر افراد خاندان کا بیدردانہ قتل، جسے میرے بچپن کی آنکھ نے دیکھا تھا، آج بھی میرے لاشعور میں کسی زخمی پرندے کی طرح پھڑ پھڑاتا ہے۔ بڑے بھائی اور چچا کی شفقت آمیز پرورش، تعلیم و تربیت اور ماں کی دعاؤں ہی کا فیض ہے کہ میں نے طوفانوں کی گود میں پلنے کا فن سیکھا۔ ہمناباد (حیدرآباد کرناٹک) کی فضامیں کھیتوں، کھلیانوں، پگڈنڈیوں اور کیاریوں کے آس پاس میرے شعور نے آنکھ کھولی۔ شہرِ دکن کی شاداب ادبی فضا میں زمینِ دیدہ و دِل سے فکرِ سخن کی کونپل پھوٹی۔ شاعری مجھے ورثے میں ملی ہے۔ میرے محترم ماموں صلاح الدین نیّر کا شمار حیدرآباد کے ممتاز شعرا میں ہوتا ہے۔ حیدرآباد کی ادبی فضا سے پہلی بار میں اِن ہی کی بدولت متعارف ہوا جن کے حسنِ سلوک اور مشفقانہ برتاؤ سے مجھے اک حوصلہ ملتا رہا ہے۔

ٹوٹنے، بننے کا عمل مجھ میں برسوں رہا ہے۔ صبح سے گھروندے بنانا اور شام ہوتے ہی اُنہیں ڈھا دینا۔ چڑھتے ہوئے سورج کی طرف پہروں دیکھنا میرا محبوب مشغلہ رہا ہے۔ لہراتے رنگوں، رس بھری آوازوں اور ریشمی سایوں کی قوسِ قزح کا میرے اندر کے اِنسان نے برسوں پیچھا کیا ہے۔ جو آج صحرا کی گرم ریت بن کر میری رگوں میں خون کی طرح رواں دواں ہے۔

"صدف تمام ریت ریت" میرا پہلا شعری مجموعہ، ذات سے کائنات تک میرے پندرہ سالہ ذہنی سفر کا آئینہ دار ہے۔ خود بینی اور کائنات شناسی کی اپنے تئیں اس سعیِ پیہم میں میری فکر نے جو علاماتی اور استعاراتی تانے بانے بُنے ہیں اس کا اظہار میری شاعری ہے۔ شاعری میرے نزدیک نہ تو صنّاعی ہے اور نہ ہی تبلیغ، تحریک یا ادارے کا پلیٹ فارم۔ میرے احساس کی آنکھ کسی مخصوص عینک کی تابع نہیں۔ گرد و پیش کے واقعات کا کسی فن کار کے لاشعور میں جذب ہو جانا اُتنا ہی فطری عمل ہے جتنا کہ کسی متحرک کیمرے کا اپنے احاطے میں آئے ہوئے ہر منظر کو اپنی گرفت میں لے لینا۔ اور تخلیقی عمل ـــــ میری دانست میں شعور و لاشعور کے درمیان سانس لیتی ہوئی اُس سوچ کا نام ہے جو کسی نامعلوم لمحے میں زبان ـــ طرز، آہنگ اور اسلوب میں ڈھل جاتی ہے۔

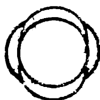
معاشرے کا کرب و انتشار، ٹوٹتے بکھرتے، بنتے بگڑتے لمحوں کی رفاقت، اقدار کی زوال پذیری، ارتقاء کے نام پر تہذیب کی بربریت اور ایسے ہی کئی محرکات میرے اندر اِک جذر و مد کی سی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں جو بلبلوں کی مانند میرے لاشعور سے شعر کی صورت اُبھر آتے ہیں۔

ڈاکٹر مغنی تبسّم کا میری شاعری پر "تجزیاتی جائزہ" ـــ "بازگشت" ـــــ ـــ اس کتاب کے آخر میں شامل ہے ـــــ مَیں ان کا شکر گزار ہوں کہ باوجود ناسازیٔ مزاج، انھوں نے یہ سیر حاصل مضمون لکھا۔

مکرمی سلام خوشنویس، اعظم راہی اور محمود سلیم کے تعاون کے بغیر اس مجموعے کی صورت گری بروقت ممکن نہ تھی جس کے لئے میں اُن کا بھی شکر گزار ہوں۔

۲۷ر دسمبر ۱۹۷۹ء

علی الدین نوید
حیدرآباد



غزلیں

۱۹۶۵ء ـــ تا ـــ ۱۹۷۹ء



ہم تو جدّت کے بھی قائل ہیں مگر کیا کیجے
ہم سے ممکن ہی نہیں دُھوپ کو سایہ لکھّیں





آنکھوں کے کنول لب کے چمن زار بہت تھے
دیوانے مگر سیر سے بیزار بہت تھے

ہم لوگ کڑی دھوپ کے شیدائی تھے' ورنہ
یوں سر کو چھپانے در و دیوار بہت تھے

ہر شخص کے چہرے پہ کئی چہرے تھے پنہاں
تجھ جیسے ترے شہر میں عیّار بہت تھے

ٹوٹا ہوا پُل، ریت کی دیوار، ہوا تیز!
لگتا ہے کہ بستی میں گنہ گار بہت تھے

الفاظ ادا کرتی رہیں بولتی آنکھیں
چُپ رہ کے بھی وہ مائلِ گُفتار بہت تھے

آنکھوں کے دریچوں میں حیا جاگ رہی تھی
سوئے تھے کچھ ایسے کہ وہ بیدار بہت تھے

وہ شخص تو ہر گام پہ دیتا رہا دھوکے
تم پھر بھی نوید اُس کے پرستار بہت تھے



کچھ ایسے صاحبِ کردار بن گئے ہم لوگ
جہاں بھی چاہا اداکار بن گئے ہم لوگ

کشاکشِ دلِ بیمار بن گئے ہم لوگ
شکستہ ناؤ کی پتوار بن گئے ہم لوگ

ہر ایک شخص ہمیں حرف حرف پڑھتا ہے
کبھی کتاب تھے، اخبار بن گئے ہم لوگ

بدن میں دھوپ کا آسیب سانس لیتا ہے
صدی کے قہر کا معیار بن گئے ہم لوگ

چلے تو دشت و بیاباں کا قہر تھا ہم میں
رُکے تو سایۂ دیوار بن گئے ہم لوگ

خموشیوں کے الاؤ میں رات بھر جل کر
بجھے تو شعلۂ اظہار بن گئے ہم لوگ

ہماری ذات تو ویسے بھی اک معمّہ ہے
کھُلے تو اور پُر اسرار بن گئے ہم لوگ

سحر کی راہ میں آنکھیں بچھا رہے تھے نوید
سحر جو آئی، شبِ تار بن گئے ہم لوگ



لمحوں کو سُولیوں پہ چڑھاتا ہوں رات بھر
آبِ رواں پہ نقش بناتا ہوں رات بھر

سُورج کے غم میں اشک بہاتا ہوں رات بھر
مرحوم دن کا سوگ مناتا ہوں رات بھر

کاغذ کی ایک ناؤ بناتا ہوں شام تک
کالے سمندروں میں چلاتا ہوں رات بھر

جیسے خدا زمیں پہ نہیں، آسماں پہ ہے
کچھ یوں دُعا کو ہاتھ اُٹھاتا ہوں رات بھر

تنہائیوں کی جھیل کے پہلو میں بیٹھ کر
زخموں کی چاندنی میں نہاتا ہوں رات بھر



ٹوٹے گی کسی دن تو کٹھن رات کی دیوار
ہوگا اسی دیوار سے خورشید نمودار

اِک شخص مِرے ساتھ رہا کرتا ہے اکثر
مُجرم کی طرح جس کا ہے سہما ہوا کردار

میں خار کے دامن سے لپٹتا ہوا سایہ
تو پھُول کی نس نس سے نکلتی ہوئی مہکار

کیا شہر سے دیوانہ کوئی روٹھ گیا ہے؟
سنسان سے لگتے ہیں گلی کوچہ و بازار

تپتی ہوئی سانسوں کو خنک چھاؤں میں لیکر
سورج کی تمازت میں جھلستے رہے اشجار



بلب کی بیمار، مدھم روشنی ہے زندگی
نیم شب، مرگھٹ کی مردہ خامشی ہے زندگی

ظلمتوں میں نور کی پیغمبری ہے زندگی
موت کا عرفان ہے خود آگہی ہے زندگی

قطرہ قطرہ دل کی رگ رگ سے ٹپکتا ہے لہو
لمحہ لمحہ جسم و جاں سے رِس رہی ہے زندگی

ہم اسے سورج کے آئینے میں کیوں کر ڈھونڈتے
شب کی اندھی وادیوں میں کھو گئی ہے زندگی

کتنی صدیوں سے شکستہ مقبروں کے آس پاس
شب کے سنّاٹے میں اکثر چیختی ہے زندگی

سرد، خستہ، مضمحل، مدقوق اور کاسہ بہ دست
ہر طرف فٹ پاتھ پہ بکھری پڑی ہے زندگی

اونچی اونچی بلڈنگوں کی آہنی آغوش میں
زرد مٹی کے گھروندے ڈھا رہی ہے زندگی

دھوپ کا کڑوا کسیلا زہر پی کر بھی نوید
بوڑھے برگد کی گھنی چھایا بنی ہے زندگی



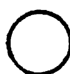
سحر کے ہاتھ میں بھی تیرگی کا کاسۂ سر ہے
نئے سورج سے کیا مانگیں، نیا سورج گداگر ہے

میں ٹوٹا آئینہ ہوں مجھ پہ پتّھر پھینکتے کیوں ہو
تمہاری شخصیت تو دوستو! یوں بھی قد آور ہے

ہوس ہر سمت ننگی ناچتی پھرتی ہے سڑکوں پر
سمندر پار مت دیکھو بڑا مکروہ منظر ہے

جہاں تم ہو وہاں پہ بادلوں کا سائباں ہوگا
مرے سر پہ تو لوگو! دھوپ کا خوں ناب لشکر ہے

پگھلتی ساعتوں کے آئینے میں خود کو کیا ڈھونڈیں
پگھلتی ساعتوں کا آئینہ سیّال منظر ہے



دراز اور کہانی کا سلسلہ نہ کرو
بس ایک موڑ پہ رُک جاؤ، پھر مِلا نہ کرو

مِرے لہو سے جو مقتل کی پیاس بُجھتی ہے
خوشی سے جانبِ مقتل مجھے روانہ کرو

تکلفات کی دیوار کچھ تو رہنے دو
خود اپنے سائے سے کھُل کر کبھی مِلا نہ کرو

بدن جُھلستا ہے پاگل ہوا کے جھونکوں سے
خیال و خواب کے زخمی کواڑ وا نہ کرو

قدم قدم پہ اندھیروں کا سامنا ہے نوید
اگر ہے خوف ہوا کا تو پھر چلا نہ کرو



ہر صبح میں پتھر کی طرح سخت بنا ہوں
شام آتے ہی شیشے کی طرح ٹوٹ گیا ہوں

گرتی ہوئی دیوار کے سائے میں ٹھہر کر
چڑھتے ہوئے سورج کی طرف دیکھ رہا ہوں

اک بار کسی نے مجھے دیوانہ کہا تھا
اب تک اسی لہجے کی ادا ڈھونڈ رہا ہوں

تم صبح کے ایوان میں شاداب کھڑی ہو
میں رات کی دلدل میں اترتا ہی چلا ہوں

میں اب بھی تری ریشمی پلکوں کی زمیں پر
سیّال نگینوں کی چمک بن کے کھڑا ہوں

نذرِ خورشید احمد جامی

راتیں علیل، صبح کا چہرہ بجھا ہوا
اِس دور کا بدن ہے لہو تھوکتا ہوا

وہ سامنے کھڑا تھا مرے بُت بنا ہوا
اُس کا تمام جسم لگا بولتا ہوا

دیکھا تو دُور تک تھا اندھیروں کا سلسلہ
سوچا تو سامنے ہی تھا سورج کھڑا ہوا

اس کے بدن کی چیخ بڑی دلخراش تھی
میرا وجود آج بھی ہے کانپتا ہوا

وہ شخص چیختا ہی رہا زخم زخم زخم!
مقتل میں زور دار مگر قہقہہ* ہوا

ہر جسم پیلی دھوپ میں تحلیل تھا مگر
سڑکوں پہ سایہ سایہ ملا رینگتا ہوا

پلکوں کے سائبان میں ہر اشک سو گیا
جب سے ہے تیرے غم کا تنفّس رُکا ہوا

کرنیں نکل رہی ہیں ہر اک حرف سے نویدؔ
"دل کے ورق پہ نام ہے کس کا لکھا ہوا"

* یہاں میں نے "قہقہہ اٹھا" کے بجائے "قہقہہ ہوا" استعمال کیا ہے



اپنے سائے ہی کا قد ناپ کے اکثر ہم لوگ
جان جاتے ہیں کہ ہیں کتنے قد آور ہم لوگ

یوں چبھو دیتے ہیں احساس میں نشتر ہم لوگ
دل کو رکھ دیتے ہیں زخموں میں ڈبو کر ہم لوگ

ڈوبتی شام کا مڑتا ہوا سورج تم ہو
سانولی صبح کا نکھرا ہوا منظر ہم لوگ

ہم سے ٹوٹے ہوئے لمحوں کی حکایات سنو
زرد پتھراؤ میں پھرتے ہیں کھلے سر ہم لوگ

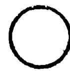
کھیت ورثے میں ملے ہیں ہمیں ایسے کہ جہاں
تیرگی کاٹتے ہیں روشنی بو کر ہم لوگ

ہم کو لے دے کے یہی ایک ہُنر آتا ہے
درد کے ناز اُٹھا لیتے ہیں ہنس کر ہم لوگ

کتنے میخانے سلامت ہیں ہمارے دم سے
گو بظاہر تو ہیں ٹوٹے ہوئے ساغر ہم لوگ

گھر کی دہلیز پہ اُس شخص کی گردن ماری
جس کو لے آئے تھے مقتل سے بچا کر ہم لوگ

ہم ہیں صدیوں کی کڑی دھوپ کی عدّت ہے نوید!
پیاس اتنی ہے کہ پی جائیں سمندر ہم لوگ



احساس دیکھ پائے وہ منظر تلاش کر
آنکھیں جو ہیں تو بوئے گُلِ تر تلاش کر

تیرا بدن تو ٹوٹ گیا وصل ہی کی شب
اب آئینے میں خود کو نہ دن بھر تلاش کر

ہر دل سے مانگتا ہے جو تازہ لہو کی بھیک
بستی میں کوئی ایسا گداگر تلاش کر

میرا وجود جذب ہوا تیرے جسم میں
اب مجھ کو اپنے جسم کے اندر تلاش کر

تنہائیوں کے گہرے سمندر میں ڈوب جا
زخموں کے پھول، درد کے گوہر تلاش کر

میں تھک گیا ہوں خاک بیاباں کی چھان کر
موجِ نسیم! تُو ہی مرا گھر تلاش کر

دشتِ وفا میں یوں نہ بھٹک دربدر نویدؔ!
سر بن گیا ہے بوجھ تو پتھر تلاش کر



دن کا قاتل ہوں میں سُولی پہ چڑھا دو مجھ کو
رات کے گہرے سمندر میں بہا دو مجھ کو

کھڑکیاں ہنستی ہوں، دروازے کھلا کرتے ہوں
شہر میں ایک تو گھر ایسا دکھا دو مجھ کو

کب سے تنہائی کا آئینہ لئے پھرتا ہوں
سنگ اندازوں کی بستی کا پتہ دو مجھ کو

لمحہ لمحہ مجھے سولی پہ چڑھاتے کیوں ہو
اک شکستہ سی تو دیوار ہوں، ڈھا دو مجھ کو

میں کوئی برف نہیں ہوں کہ پگھل جاؤں گا
لمس کی آگ ہیں جب چاہے جلا دو مجھ کو

دُور کہساروں پہ جب شام اُتر آئے تو پھر
کھول دو بابِ قفس اور اُڑا دو مجھ کو



آنکھوں میں زرد خواب کا جب تک لہو رہے
بے حاصلی کا کرب ہی زیبِ گلو رہے

تنہائیوں میں خود سے اُلجھنے کی خُو رہے
کوئی نہ ہو تو اپنا ہی سایہ عدو رہے

صحرا کی دھوپ ہم میں رواں ہے تو کیا ہوا
شہروں میں ہم ہی آئینۂ رنگ و بُو رہے

تہذیب میکدے کی دھواں ہو گئی نوید
میخوار ہی رہے نہ وہ جام و سبو رہے



سناٹوں کے لب صدیوں سے چوم رہا ہوں
آوازوں کے شہر! ترا مفہوم رہا ہوں

دل کی بینائی سے کیا محروم رہا ہوں
آنکھ میں مُردہ سورج لے کر گھوم رہا ہوں

برسوں پہلے مجھ سے میرا قتل ہوا ہے
خود سے آنکھ بچا کر اب تک گھوم رہا ہوں

خوابوں کے ملبے میں دب کر ٹوٹ گیا ہوں
ورنہ میں تو برسوں شہرِ روم* رہا ہوں

کوئی کولمبس مجھ کو بھی دریافت کرے گا
اِک سنسان جزیرہ، نامعلوم رہا ہوں

مجھ میں کتنی ہی راتیں کروٹ لیتی ہیں
اور میں "سورج گھر" ہی سے موسوم رہا ہوں

مجھ میں نویدؔ اب اور بھلا کیا خاک بچا ہے
آنکھوں میں اک افسانہ منظوم رہا ہوں

* ROME



اونچی عمارتوں میں اُجالا تھا بلب کا
فٹ پاتھ چاندنی کا بدن چومتا رہا

میرے قریب رہ کے بھی وہ مجھ سے دور تھا
برسوں میں طے نہ ہو سکا لمحوں کا فاصلہ

تنہا جو آئینے کے مقابل کبھی گیا
میرا ہی چہرہ میرے لئے اجنبی لگا

جمنے لگی ہے گردِ شب و روز درد کی
دھندلا رہا ہے صبحِ تمنّا کا آئینہ

راتوں کا کرب، دن کے سمندر میں جھونک کر
سڑکوں کی بھیڑ بھاڑ میں وہ گھومتا رہا

شب ٹوٹنے لگی ہے سنبھل جاؤ اب نوید
سورج سمجھ نہ لے کہیں آنکھوں کا ماجرا



کچھ یوں ہوا وہ دُور کہ نزدیک آگیا
اُس کا وجود میرے بدن میں سما گیا

بادل سمندروں سے گلے ملنے کیا گیا
صحرا کو تیز دھوپ کا آسیب کھا گیا

اُس کے کھنچاؤ میں بھی لگاوٹ ہے کیا کریں
وہ بے وفا سہی، پہ طبیعت کو بھا گیا

اُس کا خیال آتے ہی تنہائی مر گئی
سنّاٹا آدمی کی طرح بولتا گیا

گہری، اندھیری رات کی دیوار پھاند کر
سورج نہ جانے کب مرے کمرے میں آ گیا

اُس کو تلاشنے کا جواز اب کہاں سے لائیں
وہ جاتے جاتے نقشِ قدم بھی مٹا گیا

خود کو تراشنے کا ہُنر سیکھیے کہ اب
ہیرے تراشنے کا زمانہ چلا گیا

بُجھتے ہوئے چراغ کا ماتم نہیں نوید
سورج کے شہر کو بھی اندھیرا بُجھا گیا



ایک آواز کہ جانی ہے نہ پہچانی ہے
میری تنہائی اُس آواز کی دیوانی ہے

یہ الگ بات کہ چہرے پہ کہیں دھول نہیں
خاک ہم نے بھی بیاباں کی بہت چھانی ہے

شب کی دیوار سے ٹکرائے تو مر جائے گا
دن کی دہلیز پہ سورج بڑا جولانی ہے

ایک منظر پہ ٹھہرتی ہی نہیں برسوں سے
میری آنکھوں کی طبیعت بڑی سیلانی ہے

اس خرابے میں جہاں بھر کا سکوں ملتا ہے
دل کی ویرانی عجب طرح کی ویرانی ہے

خواب بے چہرہ لئے پھرتے ہو آنکھوں میں نوید
دن نکلنے تو دو، تعبیر کی عریانی ہے



کب ہم سے یوں ہی درد کا بارِ گراں اُٹھا
پہلے بدن میں آگ لگی پھر دھواں اُٹھا

یہ کیا کہ پھر سے درد کا سیلِ رواں اُٹھا
بارش بہت ہے تیز کہ اب سائباں اُٹھا

آنکھوں میں آفتاب کی بینائی گھول دے
پلکوں پہ ماہتاب کی پرچھائیاں اُٹھا

لفظوں کے پُل سے کچھ تو معانی کا ہو گزر
بے ربط فکر کا نہ کوئی آسماں اُٹھا

آنکھوں سے دور رتے ہی خوابوں کی کہکشاں
گرد و غبارِ شب، پسِ دیوارِ جاں اُٹھا

قُربت سے اور فاصلے بڑھتے ہیں اے نوید
دیوار دُوریوں کی، کوئی درمیاں اُٹھا



کبھی کبھی تو کچھ ایسا دکھائی دیتا ہے
ہنسوں تو آئینہ روتا دکھائی دیتا ہے

وہ دُور سے تو مجھے آدمی ہی لگتا ہے
قریب جاؤں تو سایہ دکھائی دیتا ہے

رو پہلی شام پہاڑی پہ جب اُترتی ہے
مرا وجود پرندہ دکھائی دیتا ہے

فرازِ دار سے لے کر حصارِ مقتل تک
بس ایک شخص کا چہرہ دکھائی دیتا ہے

تُو کیا گیا کہ ترا عکس کُو بہ کُو پھیلا
ہر ایک آدمی تجھ سا دکھائی دیتا ہے

بدن میں کتنے ہی سورج اُتر چکے ہیں نوید
رگوں میں پھر بھی اندھیرا دکھائی دیتا ہے

نذرِ مخدوم

میرا "میں" مجھ سے خفا ہو کے مِلا آخرِ شب
اور اونچی ہوئی دیوارِ اَنا آخرِ شب

آنکھ لگتے ہی چھناکا سا ہوا آخرِ شب
آبگینوں کا بدن ٹوٹ گیا آخرِ شب

ہاتھ تو ہاتھ تھے، ہونٹوں کو بھی جُنبش نہ ہوئی
صرف آنکھیں رہیں مصروفِ دُعا آخرِ شب

تیرا چہرہ میرے چہرے سے اُبھر آیا تھا
خود کو دیکھا تو اچنبھا سا ہوا آخرِ شب

اک سجیلا سا، دمکتا ہوا بانکا چہرہ
مطلعِ دل سے نمودار ہوا آخرِ شب

اِک شکستہ مضمحل دیوار کے سائے میں ہوں
آج اگر ہے چھاؤں میں تو کل مِرا سر دھوپ میں

ہڈیوں میں سنسناتے ہی رہے کرنوں کے تیر
پھر بھی چُپ لیٹا رہا بوڑھا گداگر دھوپ میں

ریت کا کیا، ریت تو لعل و زمرد بن گئی
کروٹیں لیتا رہا بوڑھا سمندر دھوپ میں

لمحہ لمحہ جسم کے اندر پگھلتا ہوں نوید
گو بظاہر میں پڑا ہوں بن کے پتھر دھوپ میں



تری گرفت میں آئے نہ خود کے بس میں رہے
ہم ابر بن کے ہواؤں کی دسترس میں رہے

وہ کون لوگ تھے صحرا میں جن کو پھول ملے
چمن میں رہ کے بھی ہم لوگ خار و خس میں رہے

ہماری سادہ مزاجی ہی ہم کو لے ڈوبی
ہم آسمان تھے لیکن زمیں کے بس میں رہے

وہ قافلے جو کہیں دشتِ شب میں دفن ہوئے
سحر ہوئی بھی تو آوازۂ جرس میں رہے

بجھے تو کیسے بجھے پیاس جسم و جاں کی نوید
کہ چند گھونٹ ہی پیمانۂ ہوس میں رہے



جب دل میں تیری یاد کا غم مسکرائے ہے
آنکھوں کے روزنوں میں دھنک پھیل جائے ہے

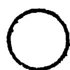
سورج کی آنکھ کھلتے ہی، کھڑکی کی راہ سے
کمرے میں تازہ پھول کوئی پھینک جائے ہے

صدیاں، ہوا کی طرح گذر جاتے ہیں کہیں
لمحہ پہاڑ بن کے کہیں ٹھیر جائے ہے

یہ تیرا جسم ہے کہ ہے جھونکا بہار کا
تو جس گلی سے جائے ہے خوشبو اڑائے ہے

کیا نام ہے، کیوں آئے ہے پوچھا نہیں کبھی
اک سایہ آدھی رات کو آکر جگائے ہے

دل ٹوٹتا ہے کب کسے معلوم اے نوید
آئینہ ٹوٹ جائے تو آواز آئے ہے



نہ طرزِ دوست، نہ رنگِ عدو سے ملتا ہے
وہ بانکپن جو تری گفتگو سے ملتا ہے

میں کیا بتاؤں یہ کس خوبرو سے ملتا ہے
جب آفتاب، لبِ آبجو سے ملتا ہے

زباں کی چاشنی ہم سے ہی پوچھئے صاحب
کبھی کا سلسلہ جا کر کبھو سے ملتا ہے

ہمارے زخم ہرے ہوں تو مسکراتے ہیں
ہمیں سکون بھلا کب رفو سے ملتا ہے

ہماری طرح یہ ہے کشتۂ ستم کہ نوید!
حنا کا رنگ ہمارے لہو سے ملتا ہے



برسوں تری آواز کے لب چوم چکا ہے
سناٹا بھی اب کانوں میں رس گھول رہا ہے

کلیوں کی چٹک سن کے یہ محسوس ہوا ہے
لہجہ ہے اسی شخص کا آواز جدا ہے

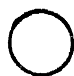
تنہائی میں اکثر یہی محسوس ہوا ہے
جیسے تو مرے جسم کے اندر ہی کھڑا ہے

سنّاٹے کو احساس کی آنکھوں سے تو دیکھو
سنّاٹا بھی آواز کا نقشِ کفِ پا ہے

یہ شہرِ تمنّا بھی عجب شہر ہے لوگو!
دیکھو تو کڑی دھوپ ہے، سوچو تو صبا ہے

خورشید کو کل ہم نے جہاں دفن کیا تھا
سُنتے ہیں کہ خوشبو کا وہاں شہر اُگا ہے

ٹوٹے ہوئے لمحوں کا بدن کیسے چھپائیں
ہر موڑ پہ حالات کا آئینہ جڑا ہے



اک زمانے تک تو بس ایسا ہوا
جس طرف وہ تھا اُدھر چہرہ ہوا

ایک پل کی بازیابی کے لئے
فاصلہ طے ہم سے برسوں کا ہوا

ہر کوئی رُکتا ہے مجھ کو دیکھ کر
میں بھی تیرے گھر کا دروازہ ہوا

تُو رسیلے زمزموں کا آسماں
اور میں جنگل کا سنّاٹا ہوا

دل مگر برسوں لہو روتا رہا
غم تو رخصت ہو گیا ہنستا ہوا

گھر میں، جانے کس لئے کہرام تھا
ایک خط تھا میز پہ رکھا ہوا

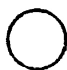
تجھ سے میری آشنائی بس یہی
تُو مسافر ہے تو میں رستہ ہوا

آئینہ در آئینہ صورت وہی
اپنا چہرہ دیکھ کر عرصہ ہوا

خواب آنکھوں سے پگھل کر بہہ گئے
شہرِ دل اک رات میں صحرا ہوا

اس قدر بے چہرگی کا خوف ہے
آئینہ دیکھے ہوئے عرصہ ہوا

اُس سے بچ کر اب کہاں جائیں نوید
وہ تو ہے ہر موڑ پہ ٹھیرا ہوا



جواں لمس کا ذائقہ بن گیا تھا
وہ لمحہ ترا نقشِ پا بن گیا تھا

سرِ شام، سورج ہڑپ کر رہا تھا
اُفق سُرخ گوں اژدہا بن گیا تھا

ہر اک شخص اوڑھا ہوا تھا تکلّف
ترا شہر بہروپیا بن گیا تھا

لبوں پر تبسّم بکھرنے سے پہلے
ترے درد کا قہقہہ بن گیا تھا

میں جنگل کی بوجھل ہوا میں مقیّد
وہ خوشبوئے دستِ صبا بن گیا تھا

کہاں تک میں آئینۂ دل بچاتا
سراپا وہ سنگِ جفا بن گیا تھا



جب بھی آدھی رات کو ہم گھر گئے
چاندنی کا جسم میلا کر گئے

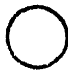
پتھروں کی چیخ سن کر ڈر گئے
یک بہ یک بوڑھے سمندر مر گئے

دل میں مُردہ سورجوں کی راکھ تھی
رات جب ہم جسم کے اندر گئے

چاہتوں کے سر پھرے پتھراؤ میں
ہم نہ جانے کیوں، برہنہ سر گئے

نیلم و یاقوت آنکھیں بن گئیں
جب تمناؤں کے ساغر بھر گئے

آسماں قدموں کے نیچے تھا نوید!
اُڑ کے ہم خوابوں کی دھرتی پر گئے



فن ہے نازک بہت بُت گری کی طرح
تیشۂ فکر پیاسی ندی کی طرح

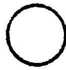
رات ڈھلتے ہی، لفظوں کی پاکیزگی
کیوں اُترتی ہے ہم پہ وحی کی طرح

آدمی کے لبادے میں سورج ہے وہ
میری آنکھیں ہیں سورج مکھی کی طرح

میرے چہرے کی افسردگی پہ نہ جا
تیری آنکھوں میں کیا ہے نمی کی طرح؟

زخم انگڑائی لے کر چٹکنے لگے
تیرے لہجے کی دوشیزگی کی طرح

چھوڑ جاتی ہے آنکھوں میں خوابوں کی ریت
یاد اس کی ہے بہتی ندی کی طرح



خمارِ شب کا سحر دم رہا ہے آنکھوں میں
تمہاری زُلف کا ہر خم رہا ہے آنکھوں میں

وہ دن بھی آئے گا آنکھوں سے زخم ٹپکیں گے
ابھی تو صرف لہو جم رہا ہے آنکھوں میں

کوئی بھی رُت ہو مہکتا ہے صرف ساون ہی
یہ کس کا دیدۂ پُرنم رہا ہے آنکھوں میں

سُلگتے شہر، اُجڑتے مکاں، جھلستے بدن
کثافتوں کا دھواں جم رہا ہے آنکھوں میں

نویدؔ خواب اُگاؤ نہ اِن جزیروں میں
کہ دھوپ چھاؤں کا عالم رہا ہے آنکھوں میں



غم میں لذت ہے، نہ زخموں میں ہنسی باقی ہے
نبضِ دل مثلِ چراغِ سحری باقی ہے

دل کا کشکول تو زخموں سے بھرا ہے لیکن
تیرے دیوانوں کی دریوزہ گری باقی ہے

اب بھی آنکھوں کے جزیروں میں اُترتے ہیں کنول
اب بھی ہونٹوں پہ تراشیدہ ہنسی باقی ہے

مِری رگ رگ کا لہو چُوس چکی ہیں، پھر بھی
تِری یادوں کی وہی تشنہ لبی باقی ہے

جانے کیوں جسم کا نیلام سلامت ہے نوید
حُسنِ یُوسف، نہ زلیخا نظری باقی ہے



ہاں یہ بھی سچ نہیں کہ اداکار ہم نہیں
جھوٹی انا کے آئینہ بردار ہم نہیں

کیوں دیکھتے ہو چشمِ تحیر سے بار بار
لوگو! ابھی تو نقش بہ دیوار ہم نہیں

صدیوں سے ڈھونڈتے ہیں جو اپنے وجود کو
کچھ اور سرپھرے بھی ہیں، دو چار ہم نہیں

بکھری ہیں آب و گِل میں ہماری نشانیاں
ڈھونڈو ہمیں یہیں کہ اُفق پار ہم نہیں

صبحِ ازل سے شامِ ابد تک ہیں ہم ہی ہم
کس نے کہا کہ وقت کی رفتار ہم نہیں

لکھّے گئے ہیں ایک انوکھی زبان میں
تم جس کو پڑھ سکو گے وہ اخبار ہم نہیں

وہ کون سے ستم تھے جو ہم پر نہ ہو سکے
کس کربِ ناتمام سے دوچار ہم نہیں

تیری زمیں کا بوجھ سلیقے سے بانٹ لیں
اے آسمان! اتنے بھی مختار ہم نہیں

لہروں پہ چل رہے ہیں مثالِ ہوا نویدؔ
بوڑھے سمندروں کے لئے بار ہم نہیں



چوٹ لگنے پہ بھی ہنسنے کی ادا کیسی ہے
درد کے شہر میں تہذیبِ وفا کیسی ہے

ہم نے آندھی میں چراغوں کو جلا رکھا ہے
ہم سے پوچھو کہ زمانے کی ہوا کیسی ہے

ہر قدم پہ تری آہٹ کا گماں ہوتا ہے
تجھ کو پاکر تجھے کھونے کی سزا کیسی ہے

کاش! ہم درد کے مارے بھی کبھی سن پاتے
زندگانی! ترے قدموں کی صدا کیسی ہے

راستے چپ ہیں، در و بام پہ سناٹا ہے
جانے اس شہر کی اب آب و ہوا کیسی ہے

تیرے کاندھے پہ ترا خود ہی جنازہ تھا نوید
تو ہی اس خواب کی تعبیر بتا کیسی ہے



یہ کیسی فصل آنکھ میں بونے لگے ہیں ہم
تُجھ کو لگی ہے چوٹ تو رونے لگے ہیں ہم

جب چاہا توڑ موڑ دیا اپنے آپ کو
تیرے بغیر خود کو کھلونے لگے ہیں ہم

تجھ سے بچھڑ کے یوں ہے زمانے کی ہر خوشی
جیسے گلاب ریت میں بونے لگے ہیں ہم

اِک تیری سمت دیکھ کے دیکھا جو آئینہ
تجھ سے حسین تجھ سے سلونے لگے ہیں ہم

اِک بوجھ ہے کہ دل پہ مسلسل دھرا ہوا
اِک زخم ہے کہ روح میں بونے لگے ہیں ہم

طوفاں سے بچ کے آئے مگر جانے کیوں نوید
ساحل کے پاس ناؤ ڈبونے لگے ہیں ہم



کیا جانیے کب آخرِ شب آئینے ٹوٹے
جب نیند میں تھا شہرِ حلب آئینے ٹوٹے

اُس رات میں اندر سے بہت ٹوٹ چکا تھا
جس رات تری یاد کے سب آئینے ٹوٹے

وہ شخص تو پتھر کے مکانوں کا امیں تھا
اُس شخص سے کیا پوچھتے کب آئینے ٹوٹے

خورشید کو نیزوں پہ اُچھالا گیا جیسے
سڑکوں کا بدن سُرخ تھا جب آئینے ٹوٹے

ایک شخص کے ادنیٰ سے اشارے کی بدولت
جب رنگ پہ تھی بزمِ طرب آئینے ٹوٹے

فرزانے تو ماہر تھے فنِ شیشہ گری میں
جب کھل گئے دیوانوں کے لب آئینے ٹوٹے



صحرا کی خشک ریت تھے، ہر سو بکھر گئے
کچھ خواب شہرِ درد میں آتے ہی مر گئے

سیّال آگ پی کے وہ جب اپنے گھر گئے
آنکھوں کا رنگ دیکھ کے آئینے ڈر گئے

پَر تولنے کو تھے کہ دھماکے سے ڈر گئے
سارے طیور شاخ پہ یکلخت مر گئے

سیلاب جب پہاڑ کے سر سے گذر گیا
تم دیکھنے کو شہر کے دیوار و در گئے؟

اندھی رفاقتوں کا ہوا جب بھی تذکرہ
آنکھوں کے روزنوں میں شرارے سے بھر گئے

شب بھر تو تیری یاد کے سائے کے ساتھ تھے
تنہائیوں کے دشت میں وقت سحر گئے

جب بھی چراغِ درد کی لو کانپنے لگی
دانستہ تیری راہگزر سے گزر گئے

جس کو ہمارے سائے سے بھی بیر تھا نوید!
اس شخص کی تلاش میں ہم در بہ در گئے



یہ زمیں جب سے سوالی ہو گئی
آسماں کی جیب خالی ہو گئی

خواہشوں کی دھجیاں اوڑھی ہوئی
زندگی کیکر کی ڈالی ہو گئی

طیش میں کچھ اور بھی وہ آ گیا
میری خاموشی ہی گالی ہو گئی

زندگی کے خال و خد کی چھوڑیئے
موت بھی اب دیکھی بھالی ہوگئی

تیرے ہلکے سے تبسّم کی لکیر
شام کے ہونٹوں کی لالی ہوگئی

میری تنہائی کا چہرہ دیکھ کر
آئینے کی شکل کالی ہوگئی

ہر گھڑی خود سے اُلجھتے ہو نویدؔ
کیا اَنا اب آنکھ والی ہوگئی؟



نظم ہو یا کہ غزل، جب کبھی تازہ لکھیں
نئے الفاظ تراشیں، نیا لہجہ لکھیں

رات آنکھوں میں اُترنے لگی لمحہ لمحہ
جب بھی سوچا ہے کہ سورج کا سراپا لکھیں

ہم کو مقتل میں جو لے آئے ہیں، اُن سے کہنا
قتل کے بعد سہی، جرم ہمارا لکھیں

جسم جاگے تھے کہ عریاں تھی ہوس آنکھوں میں
سرِ بازار جو دیکھا تھا، تماشا لکھیں

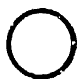
پیاس، آسیب، دھواں، دشت، چبھن، سنّاٹا
اور تنہائی کی دیوار پہ کیا کیا لکھیں!

ہم تو جدّت کے بھی قائل ہیں مگر کیا کیجے
ہم سے ممکن ہی نہیں دھوپ کو سایہ لکھیں

ریگزاروں ہی سے پیاس اپنی بجھانی ہے نوید!
جی میں آتا ہے کہ اب دشت کو دریا لکھیں

متفرق اشعار

اب درد میں لذت ہے نہ زخموں میں جلن ہے
احساس میں ناکردہ گناہوں کی تھکن ہے



دوڑے ہے اب لہو کی جگہ گرد جسم میں
تُو کیا ٹٹولتا ہے مرے زرد جسم میں



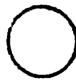
مرے وجود کی ظلمت وہیں پہ جذب ہوئی
ترے بدن کا جہاں آفتاب دیکھا ہے

وہ اک گناہ جسے لوگ پیار کہتے ہیں
اُسی گناہ میں ہم نے ثواب دیکھا ہے

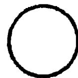
ہر سمت سے پتھراؤ ہے، کب دیکھئے کیا ہو
شیشے کے گھروندوں میں ہیں سب دیکھئے کیا ہو

دیوانے تو بے وجہ بھی رو دیتے ہیں لیکن
فرزانوں کے رونے کا سبب، دیکھئے کیا ہو

بے چہرہ بدن، سانپوں میں لپٹے ہوئے ہر سُو
آنکھوں میں ہے اِک خواب عجب، دیکھئے کیا ہو



جس آنگن میں دھوپ نہ اُترے، وہ آنگن کیا دیکھوں
سب چہرے میرے جیسے ہیں، میں درپن کیا دیکھوں



وہسکی، بیئر، دھواں، آرکسٹرا، سنّاٹے میں گُم
فرش پہ لیکن رینگ رہے تھے ننگے ننگے جسم

جب بھی تنہائی کی ناگن، ڈس لیتی ہے مجھ کو
تیرا لہجہ بن جاتی ہے میرے دل کی دھڑکن

آنکھوں سے آنسو برسانا سب کو آتا ہوگا
کم ہی لوگوں کو آتا ہے آنسو پینے کا فن

جیسے رات کے سناٹے میں مرگھٹ کی خاموشی
برسوں سے آسیب زدہ ہے میرے من کا آنگن



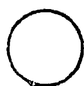
جلتے ہوئے لمحات کا آئینہ دکھا کر
ہم شہر کو شرمندۂ صحرا نہ کریں گے

ہر شام پگھلتے ہوئے لمحوں کے اُفق پر
خوابوں کے نئے چاند تراشا نہ کریں گے

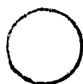
چپکی ہوئی رہتی ہیں در و بام سے آنکھیں
اِک رات بھی سوئیں نہیں آرام سے آنکھیں

کیوں شہر کی گلیوں سے گذرتے ہیں دِوانے
کیا جھانکنے لگتی ہیں در و بام سے آنکھیں؟

جب تجھ کو مرے دِل سے تعلق ہی نہیں تھا
کیوں بھیگ گئیں آج مرے نام سے آنکھیں



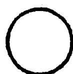
فریبِ حُسن سے آنکھیں مِلا کر
تمنّا خوبصورت ہو گئی ہے



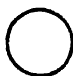
آنے والے لمحوں کا حل ڈھونڈ رہا ہوں
میں پیاسا جنگل ہوں بادل ڈھونڈ رہا ہوں

جس طرف دیکھئے، ہیں تازہ لہو کے دھبّے
مجھ کو ہر شہر نظر آتا ہے مقتل کی طرح

تیری تنہائی کا یہ سرد جزیرہ ہی نویدؔ
تجھ کو اک روز نِگل جائے گا دلدل کی طرح



جب بھی آتا ہے کوئی سامنے پتّھر کی طرح
دل کھنک اُٹھتا ہے ٹوٹے ہوئے ساغر کی طرح



وہ دِل، مسرّتوں کے خزانے کو کیا کرے
جس دل کو غم کے ناز اُٹھانے کا فن مِلے

دھواں بن کر فضا میں اُڑ رہے ہیں
ہمارے جسم مرغولے بنے ہیں

بدن میں رات گھُلتی جارہی ہے
مگر ذہنوں میں سورج اُگ رہے ہیں



جس کو جی جان سے چاہا، وہ پرایا نکلا
میں جسے جسم سمجھتا رہا، سایا نکلا



تم اپنا چہرہ کہاں چھوڑ آئے ہو آخر
بدن سمیٹ کے لائے ہوئے ہو صحرائی



تمام رات چراغوں کی طرح جل جل کر
سحر کے وقت دھواں ہو گئے ہیں کیا کیجے



نظمیں

۱۹؍۷۰ تا ۱۹؍۷۹



ہر ایک شخص ہمیں حرف حرف پڑھتا ہے
کبھی کتاب تھے، اخبار بن گئے ہم لوگ!



ندائے نور

ذہن کی دیمک زدہ، الماریوں سے
فلسفہ، حکمت، ثقافت
ارتقاء تہذیب کے
گندے، جیسے، نوچ پھینکو
فلسفہ دیوانگی ہے
ارتقاء ــــــ ایٹم کی جولانی
تمدن ــــــ بربریت کا چمکتا تیز خنجر!
خون پی پی کر بھی جو رہتا ہے پیاسا
غور سے خود میں نہ جھانکو
(تم برہنہ کل بھی تھے)

وہ ——

جو صدیوں کی ردا اوڑھے ہوئے
آندھیوں میں سانس لیتا اک دیا ہے
اس کی نورانی تپش سے
روح کی بے نور آنکھیں جگمگا لو
غار میں اُتری ہوئی
آیات
تم کو آج بھی
آواز دیتی ہیں
سُنو ——————
نزدیک جاؤ ——————

گرجتے ابابیل

اندھیرے کے اونچے پہاڑوں کے اُس پار
لپٹا ہوا ہے اُجالا سحر کا
کئی مضمحل سائے زنبیل تھامے
پہاڑوں پہ چڑھنے کی ناکام کوشش میں گُم ہیں
کئی کوہکن تھک گئے ہیں ——

گرجتے ہوئے سنسناتے ابابیل
چونچوں میں بارود کی آگ تھامے
پہاڑوں کے سینے پہ منڈلا رہے ہیں
دھماکوں کی سرگوشیاں بڑھ رہی ہیں
دھواں پھیلتا جا رہا ہے فضا میں
ابھی تو اُجالا
اندھیرے کے اونچے پہاڑوں کے اُس پار لیٹا ہے
مگر ——
ایک ساعت گذر جانے دو!

▲▲

عکسِ خونِ ناب

ڈوبتی ساعتوں کا مبجل آئینہ
پھڑپھڑاتے پرندوں کو
نغمے سنائے
تو شعلوں کی تحریر کا عکسِ خونِ ناب
آنکھوں کی گہرائیوں میں ٹٹولو
کہ فانوس ملبے کے نیچے دبلے ہیں
دھماکوں کی کا داک بوجھل فضائیں
تمہاری جبلّت کو سہلا رہی ہیں

اُفق کی سحر تاب پرچھائیوں کا بدن
ٹوٹ کر ریزہ ریزہ نہ ہو جائے
چاندنی کی جواں اُنگلیاں
کالے شانوں پہ لہرا رہی تھیں
تو تم سو رہے تھے ——
اور اب ——
آگ خورشید کی پھانکنا چاہتے ہو؟
نرخرے میں جو سیّال زخمی صدا پھنس گئی ہے
اُسے تم اُنڈیلو
جہاں آسماں ——
بانجھ، بوڑھی جٹاؤں کو جھٹکا رہا ہے!

▲▲

زندگی

تیرگی کا کفن اُوڑھ کر
سوکھے سینے پہ یادوں کے بھاری سلوں کو لئے
غم کے صحرا کی تپتی ہوئی ریت پر
درد کی آہنی، سخت زنجیر میں
ایک مدت سے جکڑی ہوئی ہے
مگر
آج تک اس کے بِچھڑے ہوئے ہونٹ پہ
چیخ تک بھی نہیں!

▲▲

تثلیث کی پیاس

کل تک میں ٹوٹا بربط تھا
یا مضراب نہ پوچھو
کمرے کی مرئل دیواروں سے چپکے
بوڑھے لمحوں کے آئینوں میں مجھ کو ٹٹولو
اپنی آنکھیں شیلف پہ رکھ دو
میری زیرو بلب کی آنکھیں چہرے پر کچھ دیر لگا کر مجھ کو ٹٹولو

بوڑھا برگد، ہنستا پنگھٹ، اڑتا آنچل
اس تثلیث نے
میرے اندر کے انسان کو چوس لیا ہے
میں کل تک کیا تھا مت پوچھو
آج مرا چہرہ کتبہ ہے
تن بوسیدہ قبر
کہ جس میں سڑی ہوئی میری اپنی ہی
لاش پڑی ہے!

▲▲

اکیسویں صدی

کنوارے خواب متقنائی ہوئی باہیں ہیں
سب کو اپنی جانب کھینچتے ہیں
آنے والی ساعتوں کو اپنی مٹھی میں جکڑتے
سارے سائے، دھوپ کی پیلی تمازت پی رہے ہیں
کرسیوں، میزوں، کتابوں سے نکل کر
لفظ آڈیٹوریم میں آ کھڑے ہیں
سارے آدرشوں کو وحشی فلسفوں نے قتل کر ڈالا
جزیرے اڑ رہے ہیں
اب
سمندر دھنستے جاتے ہیں
زمینوں میں

آئینوں کا سفر

آئینے شفاف ہوں تو عکس دھندلاتے نہیں
آئینوں کو گرد سے محفوظ رکھو
یہ کسی بھی زاویئے سے وار کر سکتی ہے ان پر
تیرگی ملبے کے نیچے دب چکی ہے
روشنی کی تازہ فصلیں اُگ رہی ہیں
گئے وہ دن کہ ہم بے بال و پَر تھے
اب اُڑ کر آسماں تک جا سکیں گے
خواب
تعبیروں کی اُجلی رہگذر پہ گامزن ہیں
آئیے خود کو تراشیں

نارسائی

اور جب میری آنکھیں کھلیں
وہ دھواں ہو گیا تھا
روشنی دُور جنگل میں بہنے لگی تھی
میں اک نقطۂ خطِ فاصل!
کوئی پرکار ایسا نہیں تھا
جو مجھ کو ملا دے کسی دائرے سے
عجب سنسناہٹ تھی
تیزاب بہنے لگا تھا رگوں میں
کوئی دندناتی ہوئی ریل پُل سے
گذر جائے جیسے!!

▲▲

نئے سُورج کی انگڑائی

اُفق کی کوکھ سے
پھر اِک نیا سُورج جنم لے گا
یہ دھرتی پھر نئی کرنوں کی
برکھا میں نہائے گی
نئے سپنوں کے پھر ہم بیج بوئیں گے
نیا سونا اُگے گا
پگھلتی ساعتوں کا کیا بھروسہ ــــــــ

اُفق کی سمت

نظریں اپنی دوڑانے سے پہلے
ہمیں خود اپنے اندر جھانکنا ہے !
دماغوں اور دِلوں میں
جو اندھیرا پل رہا ہے
اُسے دم توڑتی شب کی سیہ دہلیز ہی میں
دفن کرنا ہے
نئے سورج کی انگڑائی سے پہلے
عہد کرنا ہے
کلیسا، مندر و مسجد کے پتھر
ہماری راہ میں حائل نہ ہوں گے
ہمارے خواب اب گھائل نہ ہوں گے !!

"میں لمبی نیند لینا چاہتا ہوں"

(صدرِ مصر جمال عبدالناصر مرحوم کے آخری الفاظ)

سرفروشو!
تم محافظ ہو مقدّس نُور کے
جس کی یاقوتی شعاعیں
اَن گِنت اذہان کی اندھی گذرگاہوں کو
روشن کر رہی ہیں
نُور اُگلتی اِس مقدّس سرزمیں پہ
کوئی شیطانی قدم جمنے نہ پائے

رات کے مکروہ

زہریلے بدن پر
زرد سورج کی طرح چڑھتے رہو
آؤ اُس دجّال کی تابوت میں
آخری اِک کیل ٹھوکیں
مری بیدار آنکھوں میں
کئی راتوں کی سُرخی تیرتی ہے
مجھے اب مت جگاؤ
"میں لمبی نیند لینا چاہتا ہوں"

▲▲

تیسری آنکھ کی بے بسی

اور پھر یوں ہوا
دودھیا بلب کی روشنی میں نہایا ہوا سایہ آگے بڑھا
تنگ و تاریک، گندی گلی کی طرف مڑ گیا
دُور
گرجا کے گھنٹوں نے انگڑائی لی

پارک کے رُوبرو
اک فلک بوس عمارت کی کھڑکی کھُلی
دوسرا ایک سایہ مہکتا ہوا
رینگتا رینگتا
تنگ و تاریک، گندی گلی کی طرف بڑھ گیا
اور پھر
پہلے سائے میں ضم ہو گیا
بَلب بے بس تھا بس دیکھتا رہ گیا!!

▲▲

تخلیق

ایک پتھر —
پڑا تھا جو کل راہ میں
آج میں نے تراشا
تو بُت بن گیا!

راہ میں
ایسے کتنے ہی پتھر ملے
صرف پتھر تھے وہ
ایک بھی
بُت نہ تھا!

▲▲

وہ غوّاص اب اِک سمندر بنا ہے

(نذرِ زورؔ مرحوم)

وہ اِک آفتابی طرحدار چہرہ
دکن کے اُفق کا وہ روشن ستارہ
زبانِ دکن کا لہو بن گیا ہے
صدا، صوت کی جستجو بن گیا ہے

وہ آنکھیں ______
جو عرصہ ہوا بُجھ گئی ہیں
کتابوں کو بینائی تقسیم کر کے
دُھواں ہو گئی ہیں

ورق در ورق اب وہ چہرہ فروزاں
قلم در قلم اس کی رعنائیاں ہیں

وہ غوّاص تھا
موتیاں لا رہا تھا
مگر آج خود اک سمندر بنا ہے!
صدف سانس لیتے ہیں جس کے بدن میں
روشنی بہہ رہی ہیں
روشنی ـــــــ
تازہ فصلوں کی ماں ہے
روشنی آسماں ہے
یہ ایواں ، یہ الماریاں، یہ کتابیں
اُسی کے ہیں بیٹے
اِنہیں ذہن و دِل کا لہو دو
یہ بیٹے سمندر بنیں گے
ستیاں منظر بنیں گے !!

▲▲

درد کی موت

ذہن و دل میں اِک انوکھا درد مہکا
رات بھر
پھول زخموں کے کِھلے، کِھلتے رہے
آنکھ سے شبنم کے موتی صبح تک گرتے رہے
تنہائی کے رخسار پہ
میں نے سارے موتیوں سے اپنا دامن بھر لیا
دن نکلتے ہی
ہمیشہ کی طرح
آنکھ سوکھی اور دامن خشک تھا
ذہن و دل شاداب ہی شاداب تھے!

▲▲

"مرا آئینہ ہے وہ آئینہ"

یہ آئینہ ـــــ جو میرے سامنے رکھا ہوا ہے
بڑا بے حس، بڑا ہی سنگ دل ہے
میں تنہا جب بھی کمرے میں
دھوئیں سے کھیلتا، حلقے بناتا
تھکن کو تھپتھپاتا گم
جو انجانے میں اس کے روبرو جاتا ہوں
مجھ پر طنز کرتا ہے

اُڑ دیتا ہے چہرہ میری گردن سے مہکتا مسکراتا
لگا دیتا ہے پھر
دیمک زدہ، مریل سا چہرہ
دھنسی ہیں جس میں زیرو بلب کی بیمار آنکھیں
مجھے پھر چاٹنے لگتی ہے دیمک
یہ آئینہ مرے ہاتھوں سے کتنی بار چھوٹا ہے
مگر ثابت ہے پھر بھی
میں اب تنگ آچکا اِس آئینہ سے
یہ سوچا ہے کہ اب
اِس آئینے کو
کہیں ایسی جگہ پر چھوڑ آؤں
جہاں پر آئینے ہی آئینے ہوں

سحر سراب ہے

اندھیری رات کے جنگل سے دُور
اس جانب
سحر کے زرد سمندر کی سمت مت جاؤ
سحر سراب ہے، دھوکا ہے، اک چھلاوہ ہے
سحر وہ دھوپ کا پھیلا ہوا سمندر ہے
کہ جس میں ڈولتی رہتی ہیں موجیں کرنوں کی
سحر کی تہہ میں نہ جھانکو
سحر کی تہہ میں بھی لیٹا ہوا اندھیرا ہے

انحطاط

اس قدر کیوں سرد ہو تم
دست و پا سے پھوٹتی ہے کیوں نمی
جسم ہے یا برف کی قاشیں پگھلتی ؟
کانچ کی دیوار میں آنکھیں ابھی سے دھنس گئیں ؟
(بلب اتنی جلد مدھم پڑ گئے)
یہ کمر پہ ہاتھ کیسا
سانس میں پھنکار کیوں ؟
تھک گئے —!
تم ابھی تو صرف پندرہ سیڑھیاں ہی چڑھ سکے ہو
دور ہے منزل بہت !

▲▲

"اِک نیا سُورج اُگے گا"

آہنی محبس کی زہریلی فضا میں
زندگی کتنی نڈر تھی
موت کی باہوں میں باہیں ڈال کر
کِس بانکپن سے گامزن تھی
(جیسے محبوبہ سے محوِ گفتگو ہو)
اُس جیالی زندگی کو آج سُولی پر چڑھا کر مُطمئن ہو؟

روشنی کی آڑ لے کر
عدل کا دَم بھرنے والے
یاد رکھ!
ایک بے پایاں سمندر
دھوپ کی تلوار سے مرتا نہیں
تو کہ ہے جلتے ہو منظر کا خالق
تیری رگ رگ میں بھری چنگاریاں تھیں
آج شعلہ بن کے ظاہر ہو گئی ہیں

آج جو آواز مٹّی میں دَبی ہے
کل یہی آواز
لاوا بن کے بہہ نکلے گی
سڑکوں، شاہراہوں
اور گلی کوچوں کے سینوں پر
لہو مشعل بنے گا
اِک نیا سورج اُگے گا!!

▲▲

”صدف تمام ریت ریت“

آسمان ـــــــــــ
ہم سے کیا خفا ہوا
سمندروں کا خون خشک ہو گیا
ندی کی دوڑتی رگوں میں
گرم ریت جم گئی

پہاڑ پیٹتے ہیں سر
کہ اُن کے کھُر درے، گٹھیلے جسم پر
وہ شبنمی دھوپ کا سائباں نہیں
کونپلوں کے جسم زرد
کلی کلی کے لب: دعائے بے نوا
پھول پھول: خالی کاسۂ گدا
ڈالی ڈالی: اک صلیب بن گئی

ہر اک دریچہ جاں بہ لب
ہر ایک چہرہ اک سوالیہ نشان گیا
ہر اک منڈیر پر اُداسیوں کی کائی جم گئی

خود اپنا خون پیتے پیتے
ہڈیاں چباتے اپنے جسم کی
جنگلوں سے شہر کی طرف یہ کون آ گئے؟
ہم گناہگار کیا ہوئے
اِن کو اپنے اَن کیے گُناہ کی سزا ملی

ہاتھ اب اُٹھا رہے ہو؟

وہ

ڈولتی حسین رتھ
جس پہ میگھ دیو سوار تھا
کثافتوں کی کالی دھوپ دیکھ کر
اُفق میں جذب ہو گئی
ہوا کے دوش پر ہے اب
خلاء کی لاش بے کفن!
وہ ابرِ نیساں اب کہاں
صدف تمام ریت ریت!!
اُداس اُداس کھیت!!!

بازگشت

علی الدین نوید، نئی نسل کے ان شاعروں میں ہیں جو اپنے لہجے اور آواز سے پہچانے جاتے ہیں۔ لہجے کی استواری اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ فن کار کی شخصیت ایک خاص سانچے میں منضبط ہو چکی ہے۔ اسے وہ زاویۂ نظر مل چکا ہے جس کی مدد سے وہ اردگرد کے ماحول، سماج اور حیات اور کائنات سے اپنا رشتہ دریافت کرتا ہے اور پھر اپنے فکر و احساس کی ایک نئی دنیا تشکیل دے سکتا ہے۔ علی الدین نوید کی یہ دنیا اس فطری زندگی سے عبارت ہے جب انسان جنگل سے نکل آیا تھا لیکن جنگل سے اس کا رشتہ منقطع نہیں ہوا تھا۔

بھائی چارگی کے احساس کے ساتھ جو ابتدائی معاشرہ تشکیل پایا تھا اس نے چند بنیادی اخلاقی قدروں کو جنم دیا تھا۔ پھر مختلف اقطاع اور ادوار میں پیغمبروں، رشیوں اور منیوں نے جہاں انسان کی جنگل میں بازگشت کو روکا۔ وہیں تہذیب کے مادّی اور روحانی قدروں میں توازن پیدا کرنے کی کوشش کی۔ عہدِ حاضر میں یہ توازن بگڑ کر رہ گیا ہے۔ تہذیب کے نام پر شہروں میں جنگل اُگ آئے ہیں اور بہائم نے انسان کا روپ دھار لیا ہے۔ جدید تہذیب کی بربریت نے ہر چیز کو مسخ اور آلودہ کر دیا ہے۔

وہ
ڈولتی حسین رتھ
جس پہ میگھ دیو سوار تھا
کثافتوں کی کالی دھوپ دیکھ کر
اُفق میں جذب ہو گئی
ہوا کے دوش پر ہے اب
خلا کی لاش بے کفن

وہ ابرِ نیساں اب کہاں
صدف تمام ریت ریت
اُداس اُداس کھیت کھیت

اور پھر اکیسویں صدی کا یہ منظر :

کرسیوں، میزوں، کتابوں سے نکل کر
لفظ آڈیٹوریم میں آ کھڑے ہیں
سارے آدرشوں کو وحشی فلسفوں نے قتل کر ڈالا ہے
جزیرے اڑ رہے ہیں
سمندر دھنستے جاتے ہیں زمینوں میں

اگر یہ صورتِ حال مایوس کُن ہوتی تو حُزن اور اُداسی کی کیفیت شاعر کے لہجہ میں نرمی اور گداختگی پیدا کر دیتی۔ اس کے برخلاف علی الدین نوید کی شاعری میں جو آواز سُنائی دیتی ہے اس میں کربِ ناکامی کے ساتھ احتجاج کی تلخی شامل ہے۔ اور کہیں یہ آواز ایک چیخ بن جاتی ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ انسان اور انسانی قدروں سے شاعر کا اعتماد پوری طرح متزلزل نہیں ہوا ہے۔ اس کو شکایت زندگی سے ہے جو :

غم کے صحرا کی تپتی ہوئی ریت پر
درد کی آہنی سخت زنجیر میں

ایک مدت سے جکڑی ہوئی ہے
مگر ــــ
آج تک اس کے بھرے ہوئے ہونٹ پر
چیخ تک بھی نہیں

اس کے باوجود وہ انسان کے مستقبل سے مایوس نہیں ہے کیوں کہ اسے یقین ہے کہ ــــ

اُفق کی کوکھ سے
پھر اک نیا سورج جنم لے گا
یہ دھرتی پھر نئی کرنوں کی
برکھا میں نہائے گی
نئے سپنوں کے پھر ہم بیج بوئیں گے

یہ نیا سورج اس دیئے کی کوکھ سے جنم لے گا جو "صدیوں کی ردا اوڑھے ہوئے" آج بھی "آندھیوں میں سانس لے رہا ہے"۔ یہ دیا "غار میں اُتری ہوئی آیات" نے روشن کیا ہے جہاں سے آج بھی "ندائے نور" ساری انسانیت کو اپنی طرف بُلا رہی ہے۔

علی الدین نوید کی غزلیں فرہنگِ شعر اور طرزِ احساس کے اعتبار سے غزل کا وہ رنگ و آہنگ رکھتی ہیں جو ان دنوں ہندوستان کے چند نوجوان شعرا کے کلام میں محسوس ہوتا ہے۔ ان کا اکھڑا ہوا سا لہجہ مزاج کی ایسی سرکشی کو ظاہر کرتا ہے جو ناموافق حالات میں "انا" کے شدید طور پر مجروح ہو جانے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ ان کی مندرجہ ذیل دو تین غزلوں کے "تجزیاتی جائزے" کی روشنی میں ان کے شاعرانہ مزاج اور لہجے کو سمجھا جا سکتا ہے۔ مثلاً ذیل کے مطلع والی غزل میں کسی قدر سادیت پسندانہ، حقیقت نگاری جھلکتی ہے۔ قتل و خون، دہشت اور بیماری کا غیر جذباتی اور معروضی بیان بجائے خود دہشت خیز ہوتا ہے۔ مطلع میں کسی قدر ہمدردانہ تاسف جھلکتا ہے لیکن طنز آمیز تلخی کے ساتھ۔

راتیں علیل، صبح کا چہرہ بجھا ہوا
اِس دَور کا بدن ہے لہو تھوکتا ہوا

دوسرے ہی شعر (جو حسنِ مطلع ہے)

وہ سامنے کھڑا تھا مرے بُت بنا ہوا
اس کا تمام جسم لگا بولتا ہوا

میں محبوبہ کے بدن کی تصویر (JUX TA POSITION) کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ "خون تھوکتے ہوئے بدن" کے بعد ہی "بولتے ہوئے بدن" کی طرف شاعر کا متوجہ ہو جانا ہماری اس تیز رو زندگی کے اس کربناک پہلو کو نمایاں کرتا ہے کہ ہم کسی ایک جذبے سے سیراب نہیں ہونے پاتے کہ ایک دوسری ہی طرح کا احساس ہمیں آ لیتا ہے۔ متضاد کیفیات کی یلغار شدید اعصابی ہیجان میں مبتلا کر دیتی ہے یا پھر بے حسی کا شکار بنا دیتی ہے۔ موجودہ زندگی کی لایعنیت کے احساس کے ساتھ مایوسی اور بے زارگی کی فضا غزل کے مطلع سے مقطع تک پہنچ گئی ہے۔ اِس غزل میں جو دو تین خالص عشقیہ اشعار ہیں وہ بھی اس فضا سے متاثر ہو گئے ہیں ـــــ

بدن یا جسم اِس غزل کا مرکزی استعارہ ہے۔

ـــ اس دَور کا بدن ہے لہو تھوکتا ہوا
ـــ اس کا تمام جسم لگا بولتا ہوا
ـــ اس کے بدن کی چیخ بڑی دلخراش تھی
ـــ ہر جسم پیلی دھوپ میں تحلیل تھا مگر

ان کے علاوہ دیگر اشعار میں بھی جہاں جسم یا بدن کے الفاظ اِستعمال نہیں ہوئے ہیں توجہ کسی جسم ہی کی طرف منعطف ہوتی ہے۔ مثلاً "سورج سامنے کھڑا ہوا تھا" کہنے میں ایک جسم کا تصوّر اُبھرتا ہے۔ زخم، دِل، اور تنفس جیسے الفاظ بھی کسی جسم کی موجودگی کا احساس دِلاتے ہیں۔ اِس غزل کے دو شعر مجھے زیادہ اچھے لگے:

اُس کے بدن کی چیخ بڑی دلخراش تھی ؛ میرا وجود آج بھی ہے کانپتا ہوا

'بدن کی پکار' اور" بدن کے بلاوے" میں جو جنسی اور رومانی پہلو ہے۔ وہ 'بدن کی چیخ' میں نہیں ہے۔ بدن کی چیخ ایک اُفتاد کو ظاہر کرتی ہے۔ یہ افتاد بدن کی روایتی تہذیب کا ملیا میٹ ہو جانا ہے جس کے گوناگوں اسباب ہو سکتے ہیں۔ نتیجتاً جنسی حظ کی جگہ ایک دہشت کی کیفیت لے لیتی ہے۔"دل خراش چیخ" شدید ناآسودگی کو بھی ظاہر کرتی ہے۔ اِس احتمال کو بھی رد نہیں کیا جا سکتا کہ شعر کا واحد غائب اور اور واحد متکلم ایک ہی شخصیت ہیں۔

(۲) ہر جسم پیلی دھوپ میں تحلیل تھا مگر
سڑکوں پہ سایہ سایہ ملا رینگتا ہوا

اس شعر میں موجودہ عہد کی اس صورت حال کو بڑے فن کارانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ کس طرح فرد اپنی شناخت کھو چکا ہے۔ جسم اپنے خط و خال رکھتا ہے اور سایہ بے صورت ہوتا ہے۔ فردیت کھونے کے بعد اِنسان اور حشرات الارض میں فرق باقی نہیں رہا۔ دو پیروں پر کھڑے ہونے کا ظاہری امتیاز بھی ختم ہو چکا ہے اور وہ سایہ بن کر سڑکوں پر رینگتا پھر رہا ہے۔ شعر کی دلکشی اس کی صناعت کی وجہ سے بڑھ گئی ہے۔ صنعتِ تضاد کا دوہرا استعمال قابل توجہ ہے۔ سایہ، دھوپ اور جسم دونوں کا نقیض ہے۔ تضاد کا استعمال نہ صرف شاعری بلکہ بول چال کی زبان میں بھی عام ہے۔ اس کی نفسیاتی وجہ یہ ہے کہ کسی شئے کے تصوّر کے ساتھ ہی اس کے نقیض کی طرف خیال جاتا ہے لیکن تضاد جب کسی اور صنعت سے ترکیب پاجاتا ہے تو اس میں تضاد کا استعمال کنایہ کے ساتھ ہوا ہے۔

وہ سامنے کھڑا تھا مرے بُت بنا ہوا
اس کا تمام جسم لگا بولتا ہوا

محبوب کے لئے بُت کا استعارہ عام طور پر لایا جاتا رہا ہے لیکن یہاں بُت بنتا بطورِ محاورہ آیا ہے اور اس کے جواب میں "بولتا ہوا جسم" متضاد کیفیت کا حامل ہے۔ بُت اور بولتے ہیں براہِ راست تضاد نہیں ہے بلکہ بُت کے کنایہ کی تشریح پر تضاد واضح ہوتا ہے۔

ایک اور غزل : اپنے سائے ہی کا قد ناپ کے اکثر ہم لوگ
جان جاتے ہیں کہ ہیں کتنے قد آور ہم لوگ

اس غزل کا جمع متکلّم ایسے گروہ کی نمائندگی کرتا ہے جس کی مجروح انا احساسِ برتری کا شکار ہے۔ ذیل کے اشعار میں محرومیوں اور شکستوں کا داد طلب بیان " زخموں کی فخریہ نمائش بن گیا ہے۔ اِن اشعار کا طرزِ اظہار البتہ نیا ہے

ہم سے ٹوٹے ہوئے لمحوں کی حکایات سنو
زرد پتھراؤ میں پھرتے ہیں کھُلے سر ہم لوگ
کھیت ورثے میں ملے ہیں ہمیں ایسے کہ جہاں
تیرگی کاٹتے ہیں روشنی بو کر ہم لوگ

اس غزل کا یہ شعر سادیت پسندانہ طرزِ اظہار کے باوجود گہرے طنز کی وجہ سے معنی خیز اور اثر انگیز بن گیا ہے ۔

گھر کی دہلیز پہ اس شخص کی گردن ماری
جس کو لے آئے تھے مقتل سے بچا کر ہم لوگ

اس شعر میں ردیف " ہم لوگ " اتنی وسعت رکھتی ہے کہ اس کے مقابل کوئی 'تم' یا 'وہ' موجود نہیں ہے ۔ مقتول شخص بھی ' اگر اسے قتل نہ کیا جاتا تو قاتلوں ہی میں شامل رہتا ۔ محافظ اور ناجی کے قاتل بن جانے کی مثالیں ' سیاسی اور سماجی زندگی میں عام طور پر ملتی ہیں لیکن یہاں جس تجربے کو پیش کیا گیا ہے وہ نفسیاتی طور پر زیادہ پیچیدہ ہے ۔ اس پیچیدگی کے قریب پہنچنے کے لئے تھوڑی دیر کے لئے یہ فرض کر لیا جائے کہ مقتول اور قاتل دو جداگانہ شخصیتیں نہیں ہیں ۔ ہم خود اپنے محافظ ہیں اور ہم ہی اپنے قاتل ہیں ۔ یوں بھی غور کیا جا سکتا ہے کہ جس شخص کی گردن ماری گئی ہے وہ ہماری اَنا ــــ ہمارا ضمیر یا ہماری پہچان تو نہیں ہے ؟

مندرجہ ذیل غزل کے مطلع میں پہلی دو غزلوں کی سی انانیت اور خودسری نہیں ہے ۔ جذبے کو خام حالت میں اُگل نہیں دیا گیا ہے ۔ وہ فکر اور تجربے کی بھٹی میں تپ کر نکھر گیا ہے ۔ غزل کا مطلع ہے ۔

احساس دیکھ پائے، وہ منظر تلاش کر
آنکھیں جو ہیں تو بوئے گلِ تر تلاش کر

بوئے گلِ تر کو دیکھنے کی خواہش میں یہ تمنا شامل ہے کہ غیر مدرک، مدرک بن جائے۔ ایک حس کے لئے جو شئے مدرک ہوتی ہے دوسرے حواس کے لئے رازِ سربستہ بنی رہتی ہے۔ مکمل اِدراک یا بصیرت کے لئے ضروری ہے کہ تمام حواس اجتماعی طور پر اِس عمل میں شریک ہوں۔ مشموم کو مشہود میں بدلنے کی خواہش تجربے کی یکسانیت سے اُکتاہٹ اور تنوع کی تلاش کو ظاہر کرتی ہے۔ خوشبو کا مخزن 'گلِ تر' ہے لیکن گلِ تر سے جُدا ہوکر وہ ایک غیر مشہود وجود بن جاتی ہے۔ مجرد صفات کو ذات سے جُدا کرنا اور مجرد اَقدار کا تصوّر اِنسان کے لئے ممکن نہیں ہے یہی وہ صورتِ حال ہے جو وصل کو فراق بنا دیتی ہے۔ یہی وہ ازلی تشنگی ہے جو اِس شعر میں بوئے گلِ تر کی تلاش بن گئی ہے۔

اس غزل کا ایک اور قابلِ توجہ شعر یہ ہے :

میں تھک گیا ہوں خاک بیاباں کی چھان کر
موجِ نسیم ! تو ہی مرا گھر تلاش کر

اُردو اور فارسی شاعری میں گھر اور بیاباں کے تلازموں کے استعمال کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس شعر کو پڑھا جائے تو ہم اِس کی نُدرت اور اس کے حُسن سے زیادہ محظوظ ہوسکیں گے۔ بیاباں بقول غالبؔ " خانۂ مجنوں صحرا گرد" ہے۔ عشق بیاباں اور گھر میں تفاوتِ مکانی کو ختم کر دیتا ہے۔ صرف فاصلۂ احساس باقی رہ جاتا ہے اس فاصلے کو موجِ نسیم مٹا سکتی ہے۔ موجِ نسیم کا گھر کو تلاش کرنا کنایہ ہے اِس بات کا کہ دردِ ہی بیاباں کو گھر میں مبدّل کر سکتا ہے۔ اس غزل کے محولہ اشعار میں جو فن کاری اور دلکشی ہے وہ جذبات کی ہیجانی کیفیت پہ غالب آنے کے بعد ہی پیدا ہو پائی ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ شاعر سادیت، خود آزاریت کے عریاں مظاہرے کی منزل سے آگے بڑھ چکا ہے۔ علی الدین نویدؔ کی اِن غزلوں میں روایتی استعاروں اور علامتوں کا اِستعمال بہت کم ہوا ہے۔

فکر و احساس کی لہریں، علی الدین نوید کی غزلیہ شاعری میں ایجاز اور رمزیہ کاری کی وجہ سے زیادہ دل آویز، پہلو دار اور معنی خیز بن کر ابھری ہیں اور اُن کا اظہار بیشتر نور و ظلمت سے تعلق رکھنے والے استعاروں اور علائم کے ذریعے ہوا ہے ان کے علاوہ دشت، صحرا، سمندر، بادل، ریت، مقتل، صلیب، دیوار، پتھر، صدف، کھیت، سنّاٹا، آسیب، پیاس، سایہ، آئینہ، چہرہ وغیرہ جدید شاعری کے وہ علائم ہیں جنھیں نوید نے منفرد انداز میں اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ نوید کی شاعری کا واحد متکلم اس نسل کا نمائندہ ہے جسے اپنی مجبوریوں اور محرومیوں کا شدید احساس ہے لیکن وہ یہ بھی جانتا ہے کہ ایک دن آستین کا لہو پکار اُٹھے گا۔ اور اس کی مظلومیت رنگ لاکر رہے گی۔ جبر حالات سے قہر ذات تک محسوسات اور واردات کی ایک دُنیا ہے جو نوید کی شاعری میں ہماری آپ کی زندگی کو آئینہ دکھاتی ہے۔

اس دُنیا کی ایک جھلک اِن اشعار میں دیکھی جا سکتی ہے۔

کتنی صدیوں سے، شکستہ مقبروں کے آس پاس
شب کے سنّاٹے میں اکثر چیختی ہے زندگی

بادل سمندروں سے گلے ملنے کیا گیا
صحرا کو تیز دھوپ کا آسیب کھا گیا

چلے تو دشت و بیاباں کا قہر تھا ہم ہیں
رُکے تو سایۂ دیوار بن گئے ہم لوگ

تپتی ہوئی سانسوں کو خنک چھاؤں میں لے کر
سورج کی تمازت میں جھُلستے رہے اشجار

قدم قدم پہ اندھیروں کا سامنا ہے نوید
اگر ہے خوف ہوا کا تو پھر جلا نہ کرد

برسوں پہلے مجھ سے میرا قتل ہوا ہے
خود سے آنکھ بچا کر اب تک گھوم رہا ہوں

دن کا قاتل ہوں میں، سولی پہ چڑھا دو مجھ کو
رات کے گہرے سمندر میں بہا دو مجھ کو

شب ٹوٹنے لگی ہے، سنبھل جاؤ اب نوید
سورج سمجھ نہ لے کہیں آنکھوں کا ماجرا

آنے والے لمحوں کا حل ڈھونڈ رہا ہوں
میں پیاسا جنگل ہوں، بادل ڈھونڈ رہا ہوں

بے چہرہ بدن، سانپوں میں لپٹے ہوئے ہر سو
آنکھوں میں ہے اک خواب عجب دیکھئے کیا ہو

دوڑے ہے اب لہو کی جگہ گرد جسم میں
تو کیا ٹٹولتا ہے مرے زرد جسم میں

ہم لوگ کڑی دھوپ کے شیدائی تھے ورنہ
یوں سر کو چھپانے در و دیوار بہت تھے

صدف تمام ریت ریت

رُو پہلی شام پہاڑی پہ جب اُترتی ہے
مرا وجود پرندہ دکھائی دیتا ہے

سیلاب جب پہاڑ کے سر سے گزر گیا
تم دیکھنے کو شہر کے دیوار و در گئے؟

یہ زمیں، جب سے سوالی ہو گئی
آسماں کی جیب خالی ہو گئی

ابتداء میں نویدؔ کے اسلوب میں بیانیہ عنصر کسی قدر غالب تھا۔ جذبات کی یلغار کے لئے اظہار کی سہولت اِس میں تھی کہ براہِ راست خطاب سے کام لیا جائے۔ رفتہ رفتہ وہ ایمائی اور بالواسطہ اِظہار کی طرف مائل ہوتے گئے۔ اب ان کے لہجے کی تلخی، بلند آہنگی اور قطعیت بھی کم ہو گئی ہے جس سے ان کے طرزِ احساس میں تبدیلی کا پتہ چلتا ہے۔ نویدؔ کی شاعری میں زندگی کو مخصوص زاویئے سے دیکھنے کے بجائے اس کو تمام حواس کے ساتھ برتنے اور خود اپنے من میں ڈوب کر زندگی کا سُراغ پانے کی جو لگن ہویدا ہوئی ہے وہ ان کے سفرِ فن میں ایک نئے اور ــــ خوش آئند موڑ کی نشان دہی کرتی ہے۔

(ڈاکٹر) مغنی تبسّم
(ریڈر شعبہ اُردو۔ جامعہ عثمانیہ)

۱۲ ــ ۱۲ ــ ۷۹ء

نام	:	محمّد علی الدین
قلمی نام	:	علی الدین نوید
تاریخ پیدائش	:	۱۴ر جولائی ۱۹۴۴ء
مقام پیدائش	:	ہُمناباد (حیدرآباد۔ کرناٹک)
سکونت	:	351 ۔ 3 ۔ 16 چنچل گوڑہ ۔ حیدرآباد
تعلیم	:	بی۔ ایس سی ۔ ایم ۔ اے ۔ پی ۔ ایچ ڈی
پیشہ	:	تدریس